ڈاکٹر جابر حسین
اسسٹنٹ پروفیسر
گورنمنٹ ڈگری کالج، سریاب روڈ، کوئٹہ

پاکستانی اردو غزل پر تنقیدی بحثیں
(۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائی کے معروف رسائل وجرائد کے حوالے سے)

In the decades of 60s and 70s, a number of critical essays and discussions on Pakistani Urdu Ghazal were published in Urdu literary magazines. Different literary critical trends can be seen in different literary magazines in this regard. As a whole these discussions and critical essays played an important role in understanding the trends and explaining the poetic theme of Pakistani Urdu Ghazal. On the other hand this situation gradually promoted the criticism on Pakistani Ghazal.

This article shows the critical prominent trends and discussions of the decades of 1960s&1970s published in literary magazines, and also comments on the overall situation of criticism on Pakistani Urdu Ghazal.

ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں جن مؤقر رسائل وجرائد نے تنقید اور پاکستانی غزل کی تنقید کے نظری اور عملی مباحث کو اہمیت دے کر مقالات اور مضامین شائع کر دیے ان میں اسلوب)ماہ نامہ(، نیا دور)ماہ نامہ (جُرعات) سہ ماہی (، خیابان)ششماہی(، سب رس)ماہ نامہ (اوراق) ماہ نامہ (افکار)ماہ نامہ (فنون)ماہ نامہ اور (نیا پیام)پندرہ روزہ کے نام سر فہرست ہیں۔

اس دور میں متعدد بحثیں پاکستانی اردو ادب کے حوالے سے اردو رسائل وجرائد کے صفحات کی زینت بنتی رہیں۔ مثلاً پاکستانی ادب وثقافت وتہذیب کی بحث، اسلامی ادب کی بحث، ادب میں پاکستانیت کی بحث، پاکستانی غزل کو پاکستانی تہذیب وثقافت کے آئینے میں پرکھنے کا رجحان، کلاسیک شعراء کو ان کے سماجی وخارجی ماحول کے تناظر میں سمجھنے کا رجحان وغیرہ۔ ان تمام مختلف ابحاث ورجحانات نے مجموعی طور پر ساٹھ اور ستر کی دہائی کو ایک کشمکش میں مبتلا کیے رکھا۔ متذکرہ بالا ابحاث کا تعلق عمومی اور بنیادی طور پر تو تمام پاکستانی اردو اصناف ادب سے ہے۔ موضوع، طرز فکر واحساس اور فنی زاویوں کے حوالے سے ان بحثوں کا ایک نمایاں اور مضبوط تعلق غزل سے بھی ہے۔

ان دہائیوں میں ایک بحث تو "اردو ادب میں پاکستانیت" یا "پاکستانی ادب" کی رہی۔ اس بحث کا نقطہ آغاز حسن عسکری کا ایک اخباری کالم ہے جس میں انھوں نے پہلی مرتبہ یہ الفاظ استعمال کیے۔ یہ کالم ۱۹۴۷ء کے ادبی رسالہ "نیا دور" میں چھپا۔ پھر پاکستانیت یا

پاکستانی ادب کے ان الفاظ اور بحث کو ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنے مضمون "اردو ادب تقسیم کے بعد" میں چھیڑا اور کہا" اردو کا پاکستانی ادب اس طرح پیدا نہیں کر سکتے اس کے لیے ایک مضبوط پشتبان کی ضرورت ہے جو صرف ماضی فراہم کر سکتا ہے۔"(۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون "اردو ادب میں پاکستانیت کا مسئلہ" میں اسکی وضاحت کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ادب میں پاکستانیت کا مطلب محض یہ ہے کہ پاکستان میں لکھے گئے ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں وہ قومی روح منعکس کی جائے جو نظریۂ پاکستان میں موجود ہے۔

پاکستانیت محض سیاسی جغرافیائی اصطلاح نہیں بلکہ اس کے کچھ تہذیبی نظریاتی معنی بھی ہیں۔ پاکستانیت کسی علاقائی مزاج کا نام نہیں۔ اس سے مراد ایک مجموعی مسلم مزاج ہے جو اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کل مسلمانان ہند نے ایک بین الاقوامی اسلامیت کے تحت ڈھالا جس میں پوری ہندی اسلامی تہذیب آجاتی ہے۔(۲)

ماہر القادری نے "پاکستانی ادب کیا ہے" کے عنوان سے اپنے مضمون میں پاکستانی ادب کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی۔ پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کا سوال بھی تعلیمی اور ادبی رسائل میں ابھرتا رہا۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں پشاور یونیورسٹی کے "خیابان" میں اس سوال کا جواب مولانا منظور حسین ماہر القادری کی جانب سے یوں تفصیلاً چھپا۔

پاکستانی ادب وہی ادب ہے جس میں پاکستان کے مقصدِ وجود (اسلام) کی روح سموئی ہوئی ہے جو جامد نہیں نمو پسند ہے، جو خشک نہیں رنگین ہے، جو تنگ نہیں وسیع ہے بلکہ بے حد و بے کراں ہے، جو رنگین ہے مگر فحش نہیں، جس کے مطالعے سے ذوق و وجدان کو آسودگی میسر آتی ہے اور ذہن و فکر کو روشنی ملتی ہے۔(۳)

ایک بحث اس دور میں تخلیق کار کی تخلیق کو اس کے عہد کے سماجی و ثقافتی تناظر میں سمجھنے کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ بالعموم تنقید لکھنے کے حوالے سے اپنی زبان، اپنے معاشرے اور سماج کے مناظر و ماحول اور اپنی تہذیب و ثقافت کے تناظرات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ماہنامہ "ساقی" میں بیگم خورشید مرزا نے اپنے ایک مضمون "تنقید بھی تخلیق ہے" میں لکھا ہے۔

> افسوس اس بات کا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنی زبان کا مذاق سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنی روایات پر مبنی تنقیدی ذوق پیدا کریں، ہم جان بوجھ کر اپنی تنقید کا پیدا ہوتے ہی خود گلا گھونٹ رہے ہیں اور مغربی تنقید کے مقابلے میں اسکی کم مائیگی کو دیکھتے ہوئے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری زبانوں کے ادب کے مطالعے سے ہماری نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے لیکن اپنی تخلیق میں بھی اور تنقید میں بھی اپنی روایات، زبان اور معاشرے کا مذاق اور رجحانات سمجھنا ضروری ہیں۔(۴)

اسی حوالے سے پاکستانی تہذیب و ثقافت کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بعض مضامین میں یہ کوشش کی گئی کہ پاکستانی کلچر اور تہذیب کی قدیم ترین جڑیں تلاش کی جائیں اور اس ضمن میں برصغیر کی مٹی، ہوا اور پانی کو اولیت دی جائے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں نے ادیبوں کی سطح پر فکری وحدت اور قومی شعور کو ابھارا۔ پاکستان میں تخلیق پانے

والی اردو اصنافِ ادب میں "پاکستانیت" کا سوال با قاعدہ اور سنجیدہ طور پر زیرِ غور و بحث رہا۔ ۱۹۷۳ء کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا۔

اس (۱۹۷۳ء) سال ادب کے بعض اساسی سوالات کو دوسرے موضوعات پر اہمیت ملی۔۔۔ اس سال ایک سوال یہ بھی اٹھا کہ ہماری تخلیقات میں پاکستانی معاشرے کی خوشبو کیوں رچ بس نہیں سکی؟(۵)

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے پاکستانی ادب و ادیب کو دھرتی کی محبت، ارضی وابستگی اور اپنی تہذیب و ثقافت کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ قومی وحدت و اتحاد کی راہ بھی دکھا دی۔ ستّر (۷۰) کی دہائی کے رسائل و جرائد میں پاکستانی غزل پر نسبتاً زیادہ نگاہ مرتکز کی گئی۔ پاکستانی غزل کی فکری خصوصیات، فنی رویّوں اور تہذیبی و ثقافتی رجحانات کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ پاکستان میں تخلیق ہونے والے اردو غزل اس دور میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔

پاکستان میں تخلیق ہونے والی غزل اپنے ساتھ لائے ہوئے تاثرات سے پنڈ چھڑانے کے لیے لاہور، کراچی، راولپنڈی، سرگودھا اور پشاور میں تجربے کے مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ یہ غزل نئی سوچ کا پیغام تھا جس نے جاوداں حالی میں زندہ رہ کر ایک مجسم حقیقت کا رُوپ دھارا اور اپنے ابدی احساسِ تخلیق کو کلاسیکی نظریاتی اور رومانی غزل کے مقابلے میں منفرد بن کر ثابت کیا کہ مستقبل کا ذائقہ اسی غزل کا مرہونِ منت ہو گا۔(۶)

ساٹھ اور ستّر کی دہائیوں کی پاکستانی اردو غزل ایک طرف کلاسیک غزل کی روایت سے اکتسابِ فن کرتی رہی اور دوسری طرف پاکستانی سماج کے سماجی اور معاشی اتار چڑھاؤ کی عکاسی بھی کرتی رہی۔ اس لحاظ سے یہ عہد غزل کا تغیراتی عہد تھا۔ بہت سے شاعروں نے عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو بھی دیکھا جو غموں اور دکھوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس عہد نے پاکستانی اردو غزل میں "یہ، وہ اور تُو کے کردار متعارف کرائے جس سے ہماری باطنی شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ ہم اس عہد کو غزل کا نفسیاتی دور کہہ سکتے ہیں۔"(۷)

قیامِ پاکستان کے چند برس بعد تخلیق پانے والی پاکستانی غزل میں بعض روایتی اور موہوم مفاہیم کے خلاف ردّ عمل بھی ظاہر ہوا۔ استحصال سے نجات پانے، جاگیر دارانہ نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے اور سماجی و معاشی مساوات قائم ہونے کے خواب قیام پاکستان کے بعد شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے نظر نہیں آئے تو پاکستانی اردو غزل نے اپنا ردّ عمل ظاہر کیا۔ اس اعتبار سے "پہلا شدید رد عمل جو پاکستان بننے کے بعد غزل میں رونما ہوا تھا وہ اہمہ شکنی کا تھا"(۸)

پاکستانی غزل گوؤں کی تفہیم و تشریح کا سلسلہ بھی ساٹھ اور ستّر کی دہائیوں میں با قاعدہ طور پر شروع ہوا۔ متعدد ادیبوں اور نقادوں نے ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، اقبال اور دیگر شعراء کے غزلیہ کلام کی تشریح و توضیح کا ادبی فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ یہ تشریحی و توضیحی مضامین ملک کے مؤقر ادبی رسالوں مثلاً سب رس، اوراق اور فنون اور ادبی دنیا وغیرہ میں چھپ کر تفہیمِ غزل میں اپنا کردار ادا کرنے لگے۔ ناصرؔ کی غزلیات کا تجزیاتی مطالعہ بھی اس دور کا ایک ضمنی مگر مضبوط رجحان رہا۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا مضمون "ناصر کاظمی ایک جائزہ" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں مصنف نے ناصر کی غزلوں کا مزاج، رومانوی عناصر کی کار فرمائی، اس میں

کار فرما فنی رویّے سبھی امور ناقدانہ اور مدرّسانہ نقطۂ نظر سے زیرِ بحث لائے ہیں۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں جذبہ و احساس واضح نہیں ہے۔ وضاحت سے زیادہ تاثر ہے۔ یہ بھی رومانوی مزاج کی دین ہے۔۔۔ان کے رومانی مزاج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی کیفیت مستقل نہیں رہتی۔ تلوّن مزاجی ایک موڈ سے دوسرے موڈ میں ہمہ وقت ڈھلتی رہتی ہے۔(۹)

فنی رویوں کے لحاظ سے کلامِ ناصر کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے ان کے کلام میں تاثرات کے ساتھ ساتھ معنی پر زور اور جذبہ واحساس کی شناخت جیسے امور کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ہاں اے سکوتِ تشنگئ درد کچھ تو بول
کانٹے زباں کے آبِ سخن کو ترس گئے

وہ رنگ دل کو دیئے ہیں لہو کی گردش نے
نظر اٹھاؤں تو دنیا نگار خانہ لگے

ناصر کے ہاں پچاس کی دہائی میں اس رنگ کا ظہور مصنف کے مطابق انھیں لکھنوی شعری روایت کے فنّی رویّے کے قریب کرلیتا ہے۔(۱۰)

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے مضمون کے بعد مظفر علی سید کا وہ تجزیاتی مطالعہ جو انھوں نے ناصر کی ایک غزل کے حوالے سے کیا قابل توجہ ہے۔ "رہ نوردِ بیابانِ غم" کے عنوان سے ناصر کی غزل کا یہ تجزیہ ناصر پر عملی تنقید کی ایک بہترین صورت ہے۔ اُسی غزل کا تجزیہ کیا گیا ہے جس میں ۱۲ (بارہ) اشعار ہیں اور مطلع یہ ہے:

رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر

اس غزل کا مرکزی نکتہ سمجھنے کے لیے ناصر کا وہ اصول یاد رکھنا ہوگا جس کے تحت غزل میں مقصودِ کلام کی نشاندھی ردیف کے ذریعے کی جاتی ہے۔(۱۱)

متذکرہ بالا غزل کی ردیف "صبر کر صبر کر" روایتی اور عجمی تصوف کے عاجزانہ صبر کی تلقین نہیں کرتی بلکہ بدلتے حالات میں اپنا فیصلہ ذرا سوچ سمجھ کر کرنے اور کسی قسم کی جلد بازی کا شکار نہ ہونے کی راہ دکھاتی ہے۔(۱۲)

غزل کے مطلع میں مذکور "رہ نوردِ بیابانِ غم" کا مخاطب کون ہے؟ اس سوال کا جواب تجزیہ نگار نے یوں دیا ہے :

ملک کا کوئی بھی شہری جو حالات کے نئے موڑ پر سخت مشکل میں ہے اور ایسے محسوس کرتا ہے جیسے کارواں سے بچھڑ کے رہ گیا ہو یا خود شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ یقیناً دونوں بیک وقت اس غزل کے راوی بھی ہیں اور مخاطب بھی۔(۱۳)

شہر اجڑے تو کیا، ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے صبر کر صبر کر

نئے گھر کی تعمیر کا خواب گویا کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پایا۔ چنانچہ ناصر کے یہاں اب بھی یہ خواب اپنی پوری شدت کیساتھ نمود کر رہا ہے۔ اس نئے گھر کی آرزو دراصل ایک نیا پاکستان تعمیر کرنے کی خواہش ہے یا عمومی معنوں میں ایک اجتماعی تمنا جس کے پس منظر میں ہجرت کے زمانے کی تباہی کی تصویریں دلِ شاعر پر نقش ہیں۔ (۱۴)

اس دور کی پاکستانی اردو غزل میں علامتی رجحان بھی ابھر آیا۔ مصطفیٰ زیدی، عدیم ہاشمی، جمیل یوسف، وزیر آغا اور سلطان رشک وغیرہ کے یہاں یہ رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پَر میں تھا

(وزیر آغا)

سوچیں تھکی ہوئی ہیں کڑی دھوپ سر پر ہے
اب کیسے طے کریں کہ کدھر جانا چاہیے

(سلطان رشک)

یہ شاعری فکری اور علامتی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید بھی ہے کیوں کہ اس عہد میں غزل صورت و معانی سے آشنا ہوئی اور شخصیت کی تصویر کے تمام رنگ لے کر پیش منظر میں موجود رہی۔ جدید غزل کسی مخصوص عمل اور محدود واقعے میں قید نہیں بلکہ "وہ نئے لہجے، نئے تیور اور نئی کاٹ کے ساتھ اپنا تانا بانا بناتی ہے۔"(۱۵)

قیام پاکستان کے تھوڑے ہی عرصے بعد اردو کلاسیک شعراء وادباء کی تخلیقات کو سماجی، تہذیبی، تاریخی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر میں سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ۱۹۶۳ء کے "نیا پیام" میں جو کہ لاہور سے محمد اکرم کی زیرِ ادارت چھپتا تھا شاعری اور سیاست کے باہمی ربط و عدم ربط کے سلسلے میں ظفر ادیب کے احسان دانش کو لکھے گئے ایک مطبوعہ خط میں کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ سوالات بنیادی طور پر تو اُردو تنقید اور سیاست سے متعلق ہیں تاہم تنقید غزل بھی اس کے ذیل میں آجاتی ہے "کیا شاعر کا سیاست سے الگ رہنا ضروری ہے؟ کیا شاعر کی سیاست سیاسی لیڈروں کی سیاست سے الگ نہیں ہوتی؟"(۱۶)

ان سوالات کے جوابات بھی اسی مکتوب میں فراہم کیے گئے ہیں۔ شاعر سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا اور اسے الگ رہنا بھی نہیں چاہیے ورنہ اس کے شاعر ہونے پر حرف آجائے گا۔ اسکی سیاست عام سیاست سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ صرف انسانیت سے محبت کرتا ہے اور اسی سے اپنی وفاداری نبھاتا ہے۔(۱۷)

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر فروغ پانے والے مارکسی طرزِ تنقید کے تحت ادیب و فنکار کے ذوقی، انفرادی، نفسیاتی اور اس کے عہد کے سیاسی حوالوں سے ادب پارے کا تجزیہ کرنے کا رجحان تیز ہو گیا۔ فنکار کی تخلیق کی روح تک پہنچنے کے لیے اس کے خارجی، سماجی اور تاریخی اسباب و عوامل بھی اہمیت اختیار کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے ربعِ دوم سے کلاسیک شناسی کو فروغ ملا۔ مارکسی ادیبوں اور نقادوں نے اب یہ محسوس کیا کہ:

کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہمارے موجودہ اور گزشتہ زمانوں کے درمیان ایک مضبوط تہذیبی رشتے کا کام دیتا ہے۔ اس کے مطالعے کے بغیر کوئی مارکسی ناقد اپنے جمالیاتی ورثے، گزری ہوئی جماعتوں کی نفسیات، مثالی کرداروں اور لسانی معیاروں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ (۱۸)

یہی وجہ ہے کہ میرؔ، ولیؔ، مومنؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، آتشؔ، مصحفیؔ اور دیگر کلاسیک شعراء کو تاریخی تناظرات میں سمجھنے کا رجحان بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔

پاکستانی غزل کا تجزیہ کلاسیک اردو غزل کے فکری اور فنی رویوں کے تناظر میں کرنے کا رجحان نیز عہدِ حاضر کی ادبی تحریکات کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کا رویہ بھی ان دہائیوں میں نظر آتا ہے۔

"نیا دور" کراچی میں سلیم احمد نے ایک مضمون "حالیؔ سے لامساوی انسان تک" لکھا جس میں الطاف حسین حالی سے ۱۹۷۳ء تک کی اردو غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"۴۷ء کے بعد غزل کا جو دور شروع ہوتا ہے وہ چھوٹی بڑی تبدیلیوں کے ساتھ ۷۳ء تک پہنچتا ہے۔ وہ محسوساتی انسان کا دور ہے۔" (۱۹)

اس دور کے جرائد میں "لسانی تشکیلات کی تحریک" بھی زیرِ بحث و تبصرہ رہی۔ اس تحریک کے تحت اردو نظم و غزل کی روایتی اور مروجہ زبان کے موجودہ ڈھانچے میں توڑ پھوڑ کرنے کا رجحان بھی پنپنے لگا۔ افتخار جالب کی اس موضوع پر مرتب کردہ کتاب "نئی شاعری" میں شامل خود انہی کا مقالہ "لسانی تشکیلات" اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے۔ اس مقالے پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے جابر علی سید نے "لسانی تشکیلات" کے مفہوم کی اصلیت اور واقعیت سے افتخار جالب کو ناواقف قرار دیتے ہوئے یوں وضاحت کی۔

جالب صاحب بنی بنائی زبان کا درست تصور نہیں رکھتے۔ روایت اور بغاوت کا صحیح مفہوم نہیں جانتے۔ یہ صحیح مفہوم غالب، اقبال اور ن۔م راشد کی خلاقانہ زبان کا مفہوم ہے۔ لسانی تشکیلات کا صحیح مفہوم بھی یہی ہے۔ (۲۰)

سلیم احمد نے کلاسیک غزل کی فکری روایت کے تناظر میں لسانی تشکیلات کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے اس تحریک کی کوکھ سے جنم لینے والے انسان کو ایک تخریبی انسان کے ظہور سے تعبیر کیا ہے۔ لسانی تشکیلات کے زیرِ اثر پاکستانی اردو غزل نے جس انسان کے خط و خال ابھارنے کی سعی کی وہ انسان دراصل:

انسانوں کی ان (محسوساتی، جذباتی اور منطقی) تمام شکلوں میں مایوس ہو کر جو پچھلے سو سال میں ظہور پذیر ہوئیں اب صرف توڑ پھوڑ پر اتر آیا ہے۔ وہ ہر موجودہ رویّے کے خلاف ہے اور اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے انسان کی ہر شکل کی تخریب کرنا چاہتا ہے۔ (۲۱)

ساٹھ اور ستّر کی دہائیاں جہاں ایک طرف بالعموم مختلف تنقیدی نظریات اور دبستانوں کے باہمی کشمکش کی دہائیاں ہیں وہاں بالواسطہ طور پر بعض الفاظ کو تنقیدی اصطلاحوں کے طور پر بے دھڑک استعمال کا دورانیہ بھی ہیں۔ جدید، جدیدیت، اظہاریت، ہیئت، مواد، اسلوب، جمالیات، شعور، لاشعور جیسے تنقیدی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال اور ان کے معنی و اطلاق کا سلسلہ بھی جرائد و رسائل کی زینت بنتا رہا۔ اگرچہ ان اصطلاحات میں سے بیشتر کا بنیادی تعلق نظم سے ہے لیکن غزل کے حوالے سے بھی بعض اوقات ان کو

استعمال کیا جاتا رہا۔

اس ضمن میں شہزاد احمد کا مضمون "اردو غزل کے جدید تر رجحانات" اس لیے اہم ہے کہ اس میں مصنف نے اصطلاح "جدید غزل" کا اطلاق ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں تخلیق ہونے والی غزل پر کرتے ہوئے لکھا ہے:

شاعری کی جس ہیئت کو ہم جدید غزل کا نام دیتے ہیں وہ پاکستان بننے کے بعد معرضِ وجود میں آئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ غزل خالصتاً پاکستانی افکار کا مجموعہ ہے۔ (۲۲)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا ایک مضمون ایسی ہی بعض ادبی اور تنقیدی اصطلاحات کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ لفظ "اسلوب" پر لفظی اور معنوی لحاظ سے بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> کوئی مصنف اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔ یہی "کس طرح" اس کا اسلوب ہے۔ یعنی الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، صنائع و بدائع، نثر کا آہنگ، شعر کا ترنّم، آوازوں سے نقش گری۔۔۔ یہ چیزیں اسلوب کی شیرازہ بندی کرتی ہیں۔ (۲۳)

"اظہاریت "Expressionism در اصل بیسویں صدی کے آغاز میں جرمنی سے شروع ہونے والی ایک ادبی تحریک کا نام ہے۔ اسے ایک ادبی اصطلاح کے طور پر بھی برتا گیا اور تنقید کے حوالے سے اس کی حسب علم و مطالعہ وضاحتیں بھی کی جاتی رہیں مثلاً:

> اظہاریت عمل کی کئی سطحوں، اچانک اور اضطراری عمل، تخیل کی جادوگری، خوابوں کے سلسلے اور اعصاب زدہ یا کسی دباؤ میں مبتلا کرداروں کی پیشکش کا وسیلہ ہے۔ اس میں خود کلامی یا اکھڑی اکھڑی زبان کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (۲۴)

"جدیدیت" کی اصطلاح کا پرچار اور رواج بھی ساٹھ اور ستّر ہی کی دہائیوں میں خوب ہوا۔ غلام حسین اظہر اور شہزاد منظر وغیرہ اپنے مضامین میں اس کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔

اس وقت جدیدیت کی جو اصطلاح مروج ہے وہ دراصل ماڈرن ازم کے مفہوم میں مروج ہے۔ اس (جدیدیت) سے مراد کسی دور کے ادب میں ندرتِ فکر یا جدت طرازی نہیں بلکہ اس سے مراد بالکل نیا فکر و خیال اور بالکل نیا طرزِ اظہار ہے جو نہ صرف معنوی اعتبار سے نیا ہو بلکہ اسلوب اور ڈکشن کے اعتبار سے بھی نیا۔ (۲۵)

ان دو دہائیوں میں مختلف ادبی تنقیدی مکاتب کی فکری و فنی اساس سے استفادہ کرتے ہوئے پاکستانی غزل اور غزل گوؤں پر توضیحی نوعیت کے مقالات و مضامین چھپتے رہے۔ اس ضمن میں ادبی جریدہ "فنون" کا "جدید غزل نمبر" (۱۹۶۹ء) تنقید غزل کے حوالے سے اہم مضامین و موضوعات کا حامل رہا۔ اس غزل نمبر میں شامل درج ذیل مضامین اہم ہیں: ڈاکٹر حنیف فوق کا مضمون "اردو غزل کے نئے زاویے"، مجتبیٰ حسین کا مضمون "بیاض پر ایک نظر"، سید جابر علی جابر کا مضمون "جدید نظم جدید غزل اور جدید طرز اظہار"، احفاظ الرحمن کا "واحد متکلم کا شاعر" اور سلیم احمد کا مضمون "جدید غزل"۔ مجموعی طور پر ان مضامین میں تنقیدِ غزل کے ان جملہ مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے جو ان دو دہائیوں میں ادبی افق پر چھائے رہے۔ شعرا کے کلام میں استعمال شدہ الفاظ و تراکیب کا تنقیدی تجزیہ

کرنا، مخصوص علامتوں کی وضاحتیں کرنا، لسانی تغیرات کا جائزہ لینااور اسی تناظر میں عصرِ حاضر کی تفہیم و توضیح کرنااس دور کی تنقیدِ غزل کا ایک نمایاں پہلو رہا۔

مجتبیٰ حسین نے سلیم احمد کی "بیاض" میں شامل غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے یہاں استعمال شدہ بعض الفاظ مثلاً بھاؤ، قرض، ادھار، اجرت، ٹھیکا، دھندا، نفع، مزدوری وغیرہ کے حوالے سے لکھاہے کہ:

ان سے "قطعیت اور شدت کے ساتھ نئی کاروباری دنیااپنی بے نقاب تاجرانہ ذہنیت کے ساتھ ابھرتی ہے "(۲۶)

علاوہ ازیں کلاسیک شناسی کی ضرورت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے میرؔ، غالبؔ، ولیؔ، مومنؔ، اکبرؔالہ آبادی، نظیر اکبر آبادی، بہادر شاہ ظفرؔ جیسے شعرائے غزل پر عمرانی، مارکسی اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی حامل تنقیدی کاوشیں ہوتی رہیں۔

یہ تمام بحثیں ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ غزل اور جدید غزل کی فکری اور فنی تفہیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ غزل کی فنی مبادیات پر مضامین لکھے گئے۔ غزل اور عصرِ حاضر کے تناظر میں لکھے گئے مضامین اور نئی غزل کی فکری و فنی خصوصیات کو واضح کرنے کے ضمن میں سلیم احمد کے مضامین "جدید غزل" اور "غزل اور ردعمل"، ڈاکٹر رشید امجد کا مضمون "نئی غزل ایک جائزہ"، ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون "غزل"، فیض احمد فیض کا مضمون "جدید فکر و خیال کے تقاضے اور غزل" قابلِ توجہ ہیں۔

ان مضامین مین جدید غزل یعنی پاکستان میں لکھی جانے والی غزل کے فکری رویوں کی تشریح بھی کی گئی ہے اور فنی سطح پر آنے والی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی۔ کلاسیک غزل گوؤں کی غزلیات کو ان کے عہد کے سماجی اور خارجی حالات کے تناظر میں سمجھنے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ کلاسیک شعرائے غزل کی تفہیم کے ضمن میں تہذیب و ثقافت کے عنصر کو بھی نمایاں طور پر پیش نظر رکھا گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ولیؔ، آتشؔ اور میرؔ پر لکھے مقالات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ کلاسیک شناسی کے حوالے سے اس دور میں جو رجحان نمایاں رہا یہ ایک لحاظ سے ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی اور ادب و سماج کے گہرے ربطِ باہم پر زور دینے کا اثر بھی کہا جاسکتا ہے۔ متذکرہ بالا تمام رجحانات نے اس دور کی تنقیدِ غزل کو امکانات و ابحاث کی ایک وسیع دنیا کی طرف دھکیل دیا۔ اس دور میں پاکستانی اردو غزل کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کے لیے متعدد زاویے بروئے کار لانے کی گہما گہمی سی کیفیت رہی۔

حوالہ جات

۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، اردو ادب تقسیم کے بعد (مضمون)، مشمولہ: اشارات، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعت اول۱۹۹۶ء، ص ۱۷

۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو ادب میں پاکستانیت کا مسئلہ (مضمون)، مشمولہ: ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، طبع اول ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۷

۳۔ ماہر القادری، مولانا منظور حسین، پاکستانی ادب کیا ہے؟(مضمون)، مطبوعہ: خیابان (خاص نمبر)، شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی، شمارہ: ۵، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۷

۴۔ خورشید مرزا، بیگم ،تنقید بھی تخلیق ہے(مضمون)،مطبوعہ: ساقی (ماہنامہ)، جلد ۵۷، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۵

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر ،اردو ادب کا ایک سال :۱۹۷۳ (جائزہ)،مطبوعہ: اوراق (ماہنامہ)،لاہور، جلد: ۱۰، شمارہ: ۲، ۳، فروری، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۷۲

۶۔ رشید نثار ،پاکستان میں جدید اردو غزل (مضمون)،مطبوعہ: اوراق (ماہنامہ)، لاہور، شمارۂ خاص، جولائی، اگست، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰۱

۷۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۸۔ شہزاد احمد ،اردو غزل کے جدید تر رجحانات(مضمون)،مطبوعہ: فنون (ماہنامہ) لاہور، جلد ۱۳، شمارہ: ۱، ۲، جون جولائی ۱۹۷۱، ص ۵۶

۹۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ،ناصر کاظمی ایک جائزہ(مضمون)،مطبوعہ: فنون (ماہنامہ) ، لاہور، جلد: ۱۵،شمارہ: ۱، ۲، جون جولائی
۱۹۷۲، ص ۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۱۔ مظفر علی، سید ،رہ نوردِ بیابانِ غم(مضمون)،مطبوعہ: فنون (ماہنامہ) لاہور، جلد: ۱۷، شمارہ: ۴، ۵ ستمبر،اکتوبر ، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۵۔ ظہیر کاشمیری ،مارکسی تنقید(مضمون)،مطبوعہ: اوراق (ماہنامہ)، لاہور، جلد: ۱۰، شمارہ: ۲، ۳، فروری، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۶

۱۶۔ ظفر ادیب ،ادیب شاعر اور نقاد (مکتوب بنام احسان دانش)، مطبوعہ: نیا پیام(پندرہ روزہ)، لاہور، جلد ۶، شمارہ ۳، یکم فروری
۱۹۶۳ء، ص ۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۹

۱۸۔ ظہیر کاشمیری ،مارکسی تنقید(مضمون)،مطبوعہ: اوراق (ماہنامہ)، لاہور، جلد: ۱۰، شمارہ: ۲، ۳، فروری،مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۹

۱۹۔ سلیم احمد ،حالی سے لامساوی انسان تک(مضمون)،مطبوعہ: نیا دور (ماہنامہ)،پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی، شمارہ:

۶۱، ۶۲،

جولائی ۱۹۳۷ء، ص ۱۷

۲۰۔ جابر علی، سید، ،لسانی تشکیلات(مضمون)،مطبوعہ: فنون (ماہنامہ) جلد ۱۳، شمارہ: ۱، ۲، جون و جولائی ۱۹۷۱ء، ص ۳۵

۲۱۔ سلیم احمد ،حالی سے لامساوی انسان تک(مضمون)،مطبوعہ: نیا دور (ماہنامہ)،پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی، شمارہ: ۶۱، ۶۲،

جولائی ۱۹۳۷ء، ص ۱۷

۲۲۔ شہزاد احمد ،اردو غزل کے جدید تر رجحانات(مضمون)،مطبوعہ: فنون (ماہنامہ) لاہور، جلد ۱۳، شمارہ: ۱، ۲، جون جولائی ۱۹۷۱، ص ۴۹

۲۳۔ ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر ،ادبی اور تنقیدی اصطلاحات(مضمون)،مطبوعہ: فنون(ماہنامہ)، لاہور، جلد: ۱۶، شمارہ: ۶،۵، اپریل، مئی

۱۹۷۳ء، ص ۳۰

۲۴۔ ایضا،ص ۵۷

۲۵۔ شہزاد منظر ،جدیدیت(مضمون)،مطبوعہ: اوراق (ماہنامہ) لاہور، جلد:۱۰، شمارہ:۳،۲ ، فروری ، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۲۱۶

۲۶۔ مجتبیٰ حسین،بیاض پر ایک نظر(مضمون)، مطبوعہ:فنون(جدید غزل نمبر)،جنوری ۱۹۶۹ء،ص ۳۱۷